 

25-09-2017

اَلنَّاسُ مَعَادِن

مفتی منیب الرحمٰن

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں کی مثال کانوں (Mines) کی سی ہے، جیسے سونے اور چاندی کی کانیں، سوان میں سے جو زمانۂ جاہلیت میں فضیلت کا حامل تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس کی وہ فضیلت قائم رہی جب وہ فقیہ بن گئے، (مسلم 2638)''۔ علامہ علی القاری اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: انسانیت کے حوالے سے ''معدن'' سے مراد انسانی جبلتوں کا جوہر اور خیر کی وہ فطری استعداد ہے، جسے مسلسل تربیت وریاضت سے نکھارا جاسکتا ہے، جیسے سونا، چاندی، ہیرے اور جواہرات زمین میں چھپے ہوتے ہیں، پھر انہیں نکالا جاتا ہے، ان کی تراش خراش کی جاتی ہے، ان کے اندر سے کھوٹ کو نکالا جاتا ہے، انہیں پالش کر کے چمکایا جاتا ہے، سو وہی پتھر جو پاؤں کی ٹھوکر تھا، بادشاہوں کے تاج میں سجایا جاتا ہے اور گلے کا ہار بنایا جاتا ہے۔ مگر جوہر کامل کو تلاش کرنے اور نکھارنے کے لیے جوہری ہونا چاہیے، فارسی کی ضرب المثل ہے: ''قدرِ زر زرگر شناسد، قدرِ گوہر گوہری''، یعنی سونے کی قدر سنار جانتا ہے اور ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے۔ ہیرے کو تاج کی زینت بننے تک کئی مراحل سے گزارا جاتا ہے، شاعر نے کہا ہے:

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا   سو بار جب عقیق کٹا، تب نگیں ہوا

سو سیّد المرسلین رحمۃ للعالمین ﷺ انسانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کیے ہوئے جوہرِ کمال (Talent) کے شناور تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ملکہ اور علم سے جان لیتے تھے کہ کون سا انسانی ہیرا کس شعبے میں کمال رکھتا ہے اور اس کی استعداد کو کیسے نکھارا جاسکتا ہے، چنانچہ نگاہِ نبوت نے حضرت عمر بن خطاب کی شخصیت کے جوہرِ کمال کو پہچان لیا تھا، اسی لیے آپ نے اسلام کی عزت وشوکت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: ''اے اللہ! تو عمر بن خطاب سے اسلام کو غلبہ عطا فرما، (سنن ابن ماجہ: 105)''۔ اور ایسا ہی ہوا، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ''ہم (اپنی کمزوری کے باعث) کعبہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے یہاں تک کہ عمر بن خطاب نے اسلام قبول کیا، پس جب وہ اسلام لے آئے تو انہوں نے قریش سے مقابلہ کیا اور پھر انہوں نے کعبہ کے پاس نماز پڑھی اور ہم نے بھی ان کے ساتھ نماز پڑھی، (سیرت ابن ہشام، ج: 1، ص: 380)''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: عمر بن خطاب کے سوا میں کسی کو نہیں جانتا کہ جس نے علانیہ ہجرت کی ہو۔ پس جب انہوں نے ہجرت کا

ارادہ کیا، تو تلوار لٹکائی، کمان باندھی، تیر ہاتھ میں لیے اور کعبہ میں آئے، جبکہ اشراف قریش صحن کعبہ میں موجود تھے، انہوں نے بیت اللہ کے سات چکر لگائے، پھر مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی، پھر ایک ایک کر کے قریش کے پاس گئے اور کہا: تمہارے چہرے رسوا ہو جائیں، تم میں سے جو چاہتا ہو کہ اس کی ماں اُسے روئے اور اس کے بچے یتیم ہو جائیں اور اس کی بیوی بیوہ ہو جائے، تو حدودِ حرم سے باہر میرا سامنا کرلے، لیکن کوئی بھی ان کا راستہ روکنے نہیں آیا، (تاریخ الخلفاء، ج:1، ص:94، بحوالہ ابن عساکر)۔ بعض نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، لیکن فضائل میں ضعیف احادیث معتبر ہوتی ہیں۔

حضرت عمر لفظاً و معنیً فاروق تھے اور آپ حق و باطل میں مفاہمت اور باطل کے لیے کسی رُو رعایت کے قائل نہیں تھے، اس لیے غزوۂ بدر میں آپ کے ہاتھوں آپ کے ماموں قتل ہوئے اور جب قریشِ مکہ کے جنگی قیدیوں کی بابت مشورہ ہوا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، کیونکہ اس وقت تک اس بارے میں کوئی صریح حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ سو آپ نے مشورہ دیا کہ جو جس کا قریبی رشتہ دار ہو، اُسے اس کے حوالے کر دیں تاکہ اپنے ہاتھ سے دشمنِ رسول کو قتل کرے، لیکن رحمت للعالمین ﷺ نے فدیہ لے کر چھوڑنے کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے کو اختیار فرمایا۔ پھر سورۂ انفال، آیت:67 نازل ہوئی اور اس وقت کے حالات کے تناظر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کو راجح قرار دیا گیا، تاہم آپ ﷺ نے فیصلے کو برقرار رکھا۔ بعد میں جب مسلمان طاقت کی پوزیشن میں آگئے تو سورۂ محمد، آیت:4 میں تفصیلی حکم آیا اور جنگی قیدیوں کے بارے مسلمانوں کو تین آپشن دیے گئے: (۱) انہیں قید کر دیا جائے، (۲) ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، (۳) تبرّع اور احسان کے طور پر انہیں آزاد کر دیا جائے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے نورِ نبوت کے فیضان سے ایسی بصیرت عطا فرمائی تھی کہ آپ نے قضا و قدر جیسے انتہائی نازک مسئلے کو سہل انداز میں حل فرما دیا۔ آپ کا معمول تھا کہ اسلامی ریاست میں اَسفار کے دوران راستے میں آنے والی بستیوں کا دورہ کرتے تاکہ لوگوں کے احوال معلوم ہوں اور اُن کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔ وہ فتحِ بیت المقدس کے لیے شام کے سفر پر تھے کہ سَرغ کے مقام پر پہنچے۔ وہاں انہیں معلوم ہوا کہ عمواس کی بستی میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ آپ نے اکابر صحابۂ کرام سے مشورے کے بعد اس بستی میں داخل نہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں: اِس موقع پر حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے کہا: (عمر!) اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہو؟ حضرت عمر نے فرمایا: ''اے ابوعبیدہ! کاش کہ یہ بات تمہارے علاوہ کسی اور نے کہی ہوتی (یعنی یہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے)، اس لیے کہ حضرت عمر اُن سے اختلاف کو پسند نہیں فرماتے تھے، پس انہوں نے جواب دیا: ہاں! اللہ کی تقدیر سے بھاگ کر اُسی کی تقدیر کی پناہ میں جا رہا ہوں۔ اس بحث کے دوران حضرت عبدالرحمٰن بن عوف وہاں تشریف لائے اور کہا: ایسی صورتِ حال کے بارے میں میرے پاس رسول اللہ ﷺ کی واضح ہدایت موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم سنو کہ کسی بستی میں طاعون ہے، تو وہاں نہ جاؤ اور جس بستی میں یہ وبا آجائے اور تم پہلے سے وہاں موجود ہو، تو وہاں سے نکل کر باہر نہ جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں: یہ حدیث سُن کر حضرت عمر نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور چلے گئے''۔ نوٹ: یہ صحیح مسلم کی حدیث:2219 میں بیان کردہ طویل روایت کا خلاصہ ہے۔ اس لیے کہ اگر وبا زدہ بستی کے

سارے تندرست لوگ نکل کر چلے جائیں تو مریضوں کی دیکھ بھال کون کرے گا اور اموات کی تکفین وتدفین اور جنازے کا اہتمام کون کرے گا۔

اس حدیث سے ایک تو امراض کے متعدی ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ کہ اسباب کو اختیار کرنا توکل اور تقدیر کے منافی نہیں ہے اور جس حدیث میں فرمایا گیا: ''امراض متعدی نہیں ہوتے''، اس کا مطلب یہ ہے کہ امراض بالذات متعدی نہیں ہوتے، لیکن بعض امراض میں یہ صلاحیت ہوتی ہے اور جب اللہ کا حکم اور اس کی تقدیر ہوتی ہے، تو وہ متعدی ہو جاتے ہیں۔ ورنہ آج کل بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسپتالوں میں چکن گونیا اور ڈینگی جیسے متعدی امراض کا علاج ہو رہا ہے، بعض لوگ ان سے متاثر ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ بچے رہتے ہیں۔ اگر یہ امراض بذاتہا متعدی ہوتے تو کوئی بھی نہ بچتا۔ الغرض اسلام دینِ فطرت ہے اور اس کی تعلیمات بداہتِ عقل کے خلاف نہیں ہیں۔

آج کل اس پر بھی بحث چل رہی ہے کہ انسانیت کا مفاد فلاحی ریاست میں ہے، ریاست اپنے شہریوں اور رعایا کے لیے آغوشِ مادر کی طرح مہربان اور باپ کی طرح شفیق ہوتی ہے، اس کے مقابل ''سیکورٹی اسٹیٹ'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے کہ جیسے کوئی کسی دوسرے کی امانت کی حفاظت پر مامور ہو اور اس سے اُسے کوئی غرض نہ ہو کہ ریاست کے شہری کس حال میں ہیں اور ان کی ضروریات اور مسائل کیا ہیں۔ کئی سیاسی فلاسفہ نے سیکورٹی اسٹیٹ کو ایک فوجی کیمپ سے تشبیہ دی ہے کہ جسے رعایا کے بنیادی حقوق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انسانی تاریخ میں سب سے پہلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فلاحی ریاست کی بنیاد ڈالی، تمام شہریوں کے لیے حسبِ مراتب اور حسبِ ضرورت وظائف مقرر کیے، یہاں تک کہ نومولود بچوں کے لیے بھی وظیفے مقرر کیے۔ اسی لیے رعایا کے احوال معلوم کرنے کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ راتوں کو گشت کرتے اور ضرورت مندوں کے احوال معلوم کرتے تھے۔ سفرِ شام کے دوران آپ کو ایک جھونپڑی نظر آئی، آپ وہاں گئے تو اس جھونپڑی میں ایک بڑھیا رہتی تھی، آپ نے اس سے پوچھا: تمہیں امیر المومنین کی کچھ خبر ہے؟، بڑھیا نے جواب دیا: جو ہماری خبر نہ رکھے، اس کی خبر لینے سے ہمیں کیا غرض، سنا ہے وہ شام کے سفر پر نکلا ہے۔ آپ نے اس کے احوال معلوم کیے، اس کی ضروریات پوچھیں اور ان کی کفالت کا انتظام کیا، تو اس بڑھیا نے دعا کی: اللہ عمر کی جگہ تمہیں امیر المومنین بنائے اور (واقعی) وہی امیر المومنین بننے کے قابل تھے۔ حضرت عمر کہا کرتے تھے: مجھے حکمرانی کے آداب ویرانے کی ایک بڑھیا نے سکھائے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ سے اتنی اعلیٰ درجے کی محبت تھی کہ آپ نے عمرے کا ارادہ کیا اور نبی کریم ﷺ سے اجازت مانگی۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو اجازت عطا کی اور (پیار سے) فرمایا: اے میرے بھیا! ہمیں اپنی دعاؤں میں شریک کرنا، بھلا نہ دینا۔ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے: جب سے یہ کائنات قائم ہے، رسول اللہ ﷺ کا (پیار سے) ''اے میرے بھیا'' کہہ کر مخاطب کرنا مجھے کائنات کی ساری دولت سے زیادہ عزیز ہے۔

(روزنامہ دنیا، 25 ستمبر 2017ء)